پندرہ روزہ
دھلی

چنگاری

پندرہ روزہ

چنگاری

دہلی

اعلان

آئندہ شمارہ سے
ڈاکٹر قمر رئیس "مشرق کے انقلابی ادیب"
کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ شروع
کر رہے ہیں۔

معذرت

صفحات کی کمی کے سبب اپنے چند مستقل کالم
مثلاً صحت، فلم اور صریر خامہ شائع نہ کر سکے۔
قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

اس شمارے میں

قارئین - خطوط
اداریہ - ساہتیہ اکاڈمی
خودنوشت - میں جزیرہ نہیں ہوں
ادب - منظور زندبلانوش
افسانے - نیا کربلا
جھک جھک
اغوا
سیاست - وارث ہندو سیملن
سچے واقعات - بھلائی کو یا کانڈ
تذکرہ - ذکر اس پری وش کا
دوسرے مستقل کالم

مدیر۔ جمیل احمد
ادبی صفحے کی ترتیب۔ بشیر احمد
جلد۔ ۱ شمارہ۔ ۱۰ - ۱۱   قیمت۔ -/۲   سالانہ ۴۰ روپے
پتہ۔ 1410/3 رام نگر شاہدرہ۔ دہلی 110032
مطبع۔ جے کے آفسٹ پرنٹرس دہلی و اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی

قارئین

"میں جزیرہ نہیں ہوں" بے شک آپ چھاپ سکتے ہیں اس کے بارے میں کئی لوگوں نے دھمکیاں دی ہیں۔ یہی کہ اسے اردو میں ترجمہ کرنا چاہئے یہ چار برس سے چل رہا ہے لیکن اب تک ایک صفحے کا بھی ترجمہ کسی نے نہیں کیا۱ میرا خود ارادہ تھا اردو میں منتقل کرنے کا لیکن اقتصادی مجبوریوں سے معذور ہوں، پہلے ہی انقلاب چھاپ کر کافی نقصان اٹھا چکا ہوں، نکسلائٹ کے قرضے بھی ابھی ادا کرنے ہیں فی الحال تو جو بھی آمدنی ہوتی ہے، وہ اس میں لگ جاتی ہے یہ تصویر آپ نے تو شاید نہ دیکھی ہوگی، حالانکہ شاہدرہ میں ایک ہفتہ چلی تھی، میری فلموں کی بدقسمتی یہی ہے کہ صاحب ذوق حضرات پہلے ہفتے کی بھیڑ سے گھبرا کر دوسرے ہفتے پر ملتوی کر دیتے ہیں، اور دوسرا ہفتہ میری تصویر کا ہوتا ہی نہیں ہے۲ یہ ضرور لکھئے کہ AN NAT ON ISLAND کا ترجمہ کس سے کرا رہے ہیں، آپریشن سے بینائی بگڑ گئی ہے اس لئے اندازاً ہی یہ خط لکھ رہا ہوں۔

بدخطی معاف فرمائیے گا۔ قمر رئیس کو سلام ضرور کہئے گا

(خواجہ احمد عباس۔ بمبئی

۱۔ عباس صاحب کی سوانح کے ترجمے کی اشاعت اس شمارے سے شروع کی جا رہی ہے، ترجمہ بہتر نہیں ہو سکا اس لئے کہ عدیم الفرصتی کے سبب تقریباً آنکھ بند کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ایک حصے کا ترجمہ ہمیں کیدار ناتھ کوہل صاحب سے بھی ملا ہے مقررہ وقت پر اسے شائع کیا جائے گا۔ ۲ نکسلائٹ واقعی میں نہیں دیکھ سکا، حالانکہ زبردست خواہش تھی۔

میں ابھی دو دن پہلے تاجکستان سے واپس آیا ہوں وہاں مرزا ترسون زادہ کی پیدائش کا ستر سالہ جشن تھا جس میں شرکت کے لئے دعوت آئی تھی، مرحوم میرے دوست تھے اور میں دوستی کا حق ادا کرنے گیا تھا، میرا خراج محبت اور عقیدت ایک فارسی غزل کی شکل میں ہے جس کو تاجکستان میں تاجیک زبان کہتے ہیں ۱

خوشی کی بات ہے کہ آپ اصغر علی انجینیر کی کتاب "لوکاچ ایک مارکسی نقاد" شائع کر رہے ہیں ۱ اصغر علی نہایت اہم مارکسی دانشور ہیں گفتگو کی ترقی پسند ادب کی دوسری جلد میں لوکاچ اور جدیدیت کے نام سے ان کا ایک مقالہ شامل ہے کتاب شائع ہو تو میرے پاس قیمتاً بھیج دیجئے گا گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر کی دوسری جلد بالکل تیار ہے طباعت کے لئے بیس پچیس ہزار روپئے کی ضرورت ہے جو میں ابھی تک حاصل نہیں کر سکا ہوں ۱

سردار جعفری ۔ بمبئی

۱:۔ سردار جعفری کی نظم ایسا جاگ اٹھا اور ترسون زادہ کی صدائے ایشیا کا تقابلی مطالعہ تارا چرن رستوگی نے ہمیں بھیجا ہے ہم اسے جلد ہی شائع کریں گے۔

۲:۔ انجینیر کی کتاب زیر طباعت ہے۔

۳:۔ یہ اردو اکاڈمیاں گفتگو کے اس نمبر کی اشاعت کے لئے تعاون کیوں نہیں کرتیں؟

آپ کا شکوہ بجا ہے، مگر یہ خیال صحیح نہیں کہ میں آپ کا پرچہ پڑھتا نہیں البتہ اتنا گنڈے دار ہے۔

اب آپ کا خط ملا ہے غالباً پہلی بار ادھر تو بہت دن سے پرچہ نہیں آیا ۱

اختر الایمان ۔ بمبئی

۱:۔ انشاء اللہ اب باقاعدہ شائع ہوگا۔

چنگاری ملا، خط ملا دونوں کے لئے شکریہ رسالہ خوب ہے خوب ترقی کی گنجائش ہے رسالے میں نکھلا ہی ہے ذرا اور نکھلا ہی چاہئے ابھی تک ایسا لگتا ہے رسالہ کی سمت مقرر نہیں ہے چھپائی تو بہتر ہونی چاہئے دلی کے شب و روز کا کالم بہتر ہونا چاہئے اور ململ مضامین شائع کرنے سے احتراز واجب ہے، مثلاً پچھلے شمارے میں علی گڑھ پر رپورٹ اس سے بہتر ہو سکتی تھی، اور پاکستان پر مضمون بھی۔

محمد حسن ۔ دہلی

حسب وعدہ میں حرف رائیگاں کے عنوان سے اپنا پہلا کالم بھیج رہا ہوں ۔ا یہ غالباً پورے ایک صفحہ کا مواد ہے، اس عنوان کے تحت ادبی، ثقافتی، لسانی، اور سماجی مسائل پر اپنے خیالات پابندی کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرونگا، اگر یہ کالم قارئین کو پسند آیا تو لکھتا رہوں گا ورنہ معیار کچھ نیچا کر کے کسی روزانہ اخبار کے لئے لکھنے لگوں گا۔

آپ سر دست صرف یہ اعلان کر دیجئے کہ حسن نعیم اس عنوان کے تحت پابندی سے اپنے تاثرات مختلف ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر پیش کریں گے۔

اپنی ازلی کاہلی کے باعث بغیر صاف صاف لکھنے میں حرف رائیگاں والا کاغذ بھیج رہا ہوں، امید ہے کہ آپ پروف ذرا غور سے پڑھیں گے تاکہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔

حسن نعیم ۔ دہلی

ا:۔ ہمیں افسوس ہے کہ حسن نعیم صاحب کا "حرف رائیگاں" رائیگاں گیا یعنی دفتر سے سامان کی منتقلی کے سبب گم ہو گیا ہم نعیم صاحب اور قارئین دونوں سے معذرت خواں ہیں کہ اس قدر لاجواب تحریر ضائع ہو گئی۔

پتہ نہیں اپنے کس کمزور لمحے میں تم نے میرے گھر کے پتے پر چنگاری کا پانچواں شمارا بھیج دیا، ظاہر ہے تشنگی بجھ گئی۔

مبلغ ۲۰ روپئے کا پوسٹل آڈر مرسل ہے لیکن پہلے چاروں شمارے بھی بھیج دیجئے۔

راج بہادر گوڑ ۔ حیدر آباد

چنگاری دوسرے رسالوں سے مختلف ہے۔

اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں حکومت افغانستان کے اقدام کا جائزہ پاکستان سے متعلق مضمون جاپان چلو بہت پسند آئے ا

اردو سرکاری زبان کے تحت آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے درست تو ہے، مگر مابین ہمہ یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اردو زبان سیاسیات کے دائرۃ السو (VICIOUS CINEB) میں آگئی ہے بہار میں دوسری سرکاری زبان قرار دئے جانے کے باوجود اردو سے متعلقات بہم اور یکسر غیر واضح ہیں، شمارے خاصہ دقیع تناظر پیش کرتے ہیں۔

تاراچرن رستوگی ۔ گوہاٹی

ا مجتبیٰ صاحب کا سفر نامہ جاپان چلو بہت لوگوں کو پسند آیا تھا اب یہ سلسلہ ہندی سار یکا میں چل رہا ہے۔

دفتر کی منتقلی کے دوران سفر نامے کی قسطیں اور ان کی چند نایاب تصاویر ضائع ہوں گی، مگر اب معذرت سے کیا حاصل۔

میرے حساب سے چنگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام مشمولات پڑھنے کے لائق ہوتے ہیں، بہت کم رسالے ایسے ہوتے ہیں جو عام قاری کے لئے پورے دلچسپ ہوں ہر قاری اپنی پسند کے مضامین پڑھ کر بقیہ سے گزر جاتا ہے۔

میں ذاتی زندگی میں بڑا خشک اور آدم جلا واقع ہوا ہوں، لیکن جس سے کوئی رشتہ قائم کرتا ہوں اسے تمام وجود سے اپناتا ہوں اور آخر وقت تک نباہتا ہوں۔

میں نے اور تم نے جو دوستی کا رشتہ قائم کیا ہے وہ ان معمول باتوں سے کب ضائع ہوتا ہے، لہٰذا اس قسم کے چکر میں نہ پڑیئے ا

میری کتاب آگئی ہے آپ کی کاپی فوراً پہنچا دینے کی اس لئے خواہش تھی کہ میں گھر جا رہا ہوں۔ ۲

قمر احسن ۔ دہلی

ا مجھے بھی قمر احسن اور یہ رشتہ دونوں عزیز ہیں مجھے قوی امید ہے کہ وہ مقطع میں آنے والی سخن گسترانہ باتوں پر دھیان نہ دیں گے اور پھر بھی اگر کچھ تکلیف پہنچی ہو تو دوستوں سے معذرت میں جھجک کیسی؟

دراصل میرا قلم اس قدر بے لگام ہے کہ وہ بعض اوقات دوستوں اور دشمنوں میں تمیز نہیں کر پاتا ۲ آگ صحرا الاؤ پر ہم تبصرہ جلد ہی شائع کریں گے۔

یقین ہے ہر طبقہ میں رسالہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا ایک عدد غزل بعنوان "لہو" ہدیہ کر رہا ہوں فسادات اس ملک کا مقدر بن گئے ہیں، ابھی تازہ زخموں پر مرہم بھی نہیں لگتا کہ

قتل و غارت گری کی دوسری خبریں کانوں سے ٹکراتی ہیں، المیہ تو ہے کہ معصوم جانیں ان فسادات کا لقمہ بنتی ہیں، اور شر پسند عناصر دندناتے پھرتے ہیں نہ جانے اس ملک سے یہ لعنت کب دور ہوگی یقین ہے فسادات کے پس منظر میں تخلیق کردہ یہ چند اشعار آپ کو اور قارئین کو متاثر کر سکیں گے۔

۱ ۔ غزل اس شمارے میں شامل اشاعت ہے۔

تمام مشمولات کے مطالعہ کے بعد یک گونہ فرحت کا احساس ہوا کہ آئے دن جنم لینے والے رسائل کی بھیڑ چال سے ہٹ کر آپ نے جو راستہ اپنایا ہے وہ سب سے منفرد اور ممتاز ہے۔

راہی معصوم رضا کی چٹکیاں لیتی ہوئی تحریر کے کیا کہنے ابن صفی پر ابن سعید کا مضمون خاصے کی چیز ہے ایک غلطی جو کسی اعتبار سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں وہ یہ کہ فہرست کے مطابق اندر سروپ دت ناداں اور ڈاکٹر یعقوب عامر کی نظمیں اور عزیز الدین احمد کا لندن کا مشاعرہ باوجود تلاش بسیار کے کہیں نظر نہیں آئے ۱

محبوب راہی - اکولہ

۱ اس کے بعد والے شمارے میں یہ تینوں چیزیں شریک اشاعت کر لی گئی تھیں۔

آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ ہندستاں کی قسمت صرف وہی لوگ سنوار سکتے ہیں جو موجودہ نظام کے خلاف ہیں، اور ایک نئے نظام کے حامی۔

تازہ شمارے میں گہوارہ علم و ادب بہت خوب ہے یہ سلسلہ قائم رکھئے معین اعجاز کا مزاحیہ فیچر کافی دلچسپ ہے انھوں نے طنز و مزاح کے افق پر اپنی ادبی شخصیت کو نئے ڈھنگ سے ابھارنے کی کوشش کا آغاز کیا ہے،

ظہیر ناشاد - دربھنگوی

چنگاری کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ آپ اسے میرے نام جاری فرمادیں چنگاری کا زر سالانہ بذریعہ M.O روانہ خدمت کروں گا۔

عبدالوہاب نسیم - نیلور

بھئی سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کن القاب و آداب سے یاد کروں۔ ویسے آپ رسمی تکلفات کے قائل بھی نہیں۔ اس لئے سیدھے سادے انداز میں السلام علیکم

وہ جو غالب نے کہا ہے کہ ع

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

آپ سے ملنے کی تقریب یہ ہے کہ آج اچانک پرانے اوراق میں آپ کی ایک نظم نکل آئی۔ جی ہاں آپ کی ہی نظم اور وہ بھی "کلام شاعر بخط شاعر" سوچا آپ کی اس تخلیق کو آپ کے پاس بھیج دوں۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ آپ کہیں گے میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔ کیونکہ تنقید و صحافت آپ کا اصل میدان رہا ہے۔ اچھے اشعار گنگناتے ضرور تھے مگر کبھی غزل کا شعر کہنے کی کوشش نہیں کی۔ تو یہ لیجئے آپ کا فردوس گم شدہ ہے یعنی تخلیق گم شدہ جس کا عنوان ہے

انتظار مرگ آرزو

زندگی کی ندی میں
خواب کے سفینے کو
آرزو کے چپو سے
یوں ہی کھیتی رہتی ہوں
انگلیوں کے پوروں سے

خون رسنے لگتا ہے
خواہشیں نہیں تھکتیں
صحن دل کی گلیوں میں
ننھے ننھے یہ کیڑے
جانے کب تلک رینگیں
جانے کب تلک رینگیں

سُنا دو تین دن قبل آپ یہاں نازل ہوئے تھے۔ التمش نے یہ زہرہ گداز خبر سُنائی۔ اس قدر غیریت اور اجنبیت کا سُلوک آپ کے شایانِ شان نہیں۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

التمش کی زبانی آپ کی مصروف اور مشینی زندگی کے ایک ایک لمحہ کی خبر رکھتا ہوں۔

فاروق احمد صدیقی

دو خط

چنگاری کا شمارہ ملا شکریہ چنگاری پسند آیا یقین نہ کر سکا دلّی سے چنگاری جیسا زندہ دل رسالہ نکلے گا + رسالہ شاہراہ کے بعد اردو میں صرف دو قسم کے رسائل دیکھنے ملتا ہے + ایک کم پڑھے لکھے عورتوں کے لئے + دوسرا پروفیسر اور تحقیق کے لئے + یہ دونوں کے بیچ کے لوگوں کو پڑھنے لائق رسائل نکلتا بھی تو بہت جلدی بند ہو جاتے ہیں + کیرالہ میں بہت ادبی رسائل ہیں، ایک ایک رسالہ چار لاکھ کاپی تک ہفتہ میں فروخت ہوتی ہے [۱]۔ یہاں کمینسٹ تحریک کو آگے بڑھانے میں افسانے، ناول اور ڈرامہ بہت مدد دیا ہے، ایک زمانے میں اردو ادب بھی ایسا تھا، ہمارے دیس میں اردو جاننے والے بہت کم ہے [۲] اردو ادب کے ترقی پسند تحریک نے ہی میرا جیسا غریب کسان کو اردو پڑھنے پر مجبور کیا ہے، اور آج بھی میں اپنا پیٹ کاٹ کر اردو رسائل خرید کر پڑھتا ہوں [۳]، چنگاری کا بھی خریدار بنوں گا پر ایک ساتھ سالانہ چندہ دے نہ سکوں گا، چار قسط کر کے چندہ دوں گا، اگر منظور ہو تو اطلاع فرمائیں ایک قسط ۵۰/۔ بھیجدونگا آپ کے رسالے میں زندہ دل کے ڈھیر گپیں سننے ملتا ہے، اس لئے اس غریبی حالت میں بھی خریدار ہونے تیار ہوا ہے۔

ایم، این، ستیارتھی۔ کیرالا

چنگاری دو شمارے ملنے کی خوشی پر میں نے پندرہ روپئے ششماہی چندہ ارسال کیا تھا، اس کے بعد چنگاری کا کوئی شمارہ مجھے ملا نہیں، کیرالہ کے ایک ترقی پسند کسان ہونے کی وجہ سے میں آگے پیچھے نہ سوچے چندہ ارسال کیا تھا، رسالہ عصری آگہی کا چوٹ اب بھی بھولا نہیں ہوں، سالانہ چندہ وصول کیا اور خریدار کو پانچ شمارہ دیا، یقین ہے آپ کو ایسا نہ کریں گے، ایسا کرنے سے لوگوں کا اعتبار اُٹھ جائے گا، اردو زبان کے ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچے گا۔

ایم، ایس ستیارتھی۔ کیرالہ

[۱] اردو میں شمع کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا رسالہ ایک لاکھ چھپتا ہوگا [۲] میرے دوست ہمارے دیس میں اردو جاننے والے کم نہیں بہت ہیں، مگر انھیں خرید کر پڑھنے کی عادت نہیں آج بھی مائیں اپنے بچوں سے کہتی ہیں کہ اسکول کالج کی کتابیں پڑھو فضول ناول افسانے پڑھ کر وقت کیوں برباد کرتے ہو، اردو والوں کو BOOK MINDED بنانے کی ضرورت ہے [۳] اور جدید تحریک نے لوگوں کو اردو نہ پڑھنے پر مجبور کر دیا [۴] ہم بھی اپنا پیٹ کاٹ کر ہی رسالہ نکالتے ہیں میرے بھائی [۵] عصری آگہی کے بارہ شمارے ضرور ملیں گے (اگر قمر صاحب ایڈیٹنگ کے لئے وقت نکال سکے)

اُردو کے ادبی معرکے

مصنّف: ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

صفحات: ۴۴۸ قیمت: ۲۳ روپلے

اس کتاب میں مصحفی و انشا کے عہد سے غالب کے عہد تک کے تمام معرکوں کا سیر حاصل ذکر اس زمانے کے تمام تذکروں، بیاضوں، دواوین، اور دیگر دستاویزات کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ اس تحقیق سے نئے نئے انکشافات سامنے آئے ہیں۔ مصحفی، انشا، غالب اور ذوق وغیرہ کی شخصیتوں کے نئے اور دلچسپ پہلو پہلی مرتبہ اُجاگر ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی اخبار و رسائل میں ادبی معرکوں پر مضامین نظر آجاتے ہیں۔ لیکن ان میں آبِ حیات کی پامال روایتوں سے آگے بات نہیں جاتی۔ زیر نظر کتاب پہلی مرتبہ تحقیق کی روشنی میں ہر طرح کے مواد کو چھان پھٹک کر لکھی گئی ہے۔

عصری بک سنٹر 3/1410 رام نگر شاہدرہ دہلی 32

ساہتیہ اکیڈمی

(جس نے اردو دشمنی میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔)

اس بار پھر اعلان کیا ہے کہ اردو کی کوئی کتاب ۱۹۸۱ء کے انعام کی مستحق نہیں ہے۔ ججوں نے اپنی رپورٹ میں ساہتیہ اکیڈمی کے انعامی بورڈ کو بتایا کہ جنوری ۱۹۷۸ء سے دسمبر ۱۹۸۰ء تک شائع ہونے والی اردو کی کتابوں میں ایک کتاب بھی ساہتیہ اکیڈمی کے انعام کی مستحق نہیں۔

اس سال بورڈ نے ملک کی جن اکیس زبانوں کی کتابوں کو انعام سے نوازا ہے ان میں آسامی، ڈوگری، کشمیری، کونکنی، منی پوری، نیپالی، پنجابی، سندھی یہاں تک کہ میتھلی اور راجستھانی جیسی زبانیں بھی شامل ہیں۔ اس طرح ساہتیہ اکیڈمی نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ یہ زبانیں جن میں کچھ بولیاں بھی شامل ہیں ان میں اس بلند معیار کا ادب پیدا ہو رہا ہے جس پر ساہتیہ اکیڈمی کا انعام دیا جا سکتا ہے۔ صرف اردو ہی ایک ایسی بے مایہ زبان ہے جو بولیوں سے بھی گئی گزری ہے جس میں پچھلے تین سال میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی گئی جو ملک کی دوسری زبانوں اور بولیوں میں تصنیف ہونے والی کتابوں کے مقابل رکھی جا سکے اور اس نیشنل انعام کی مستحق ٹھہرے۔ اور یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی ساہتیہ اکیڈمی اردو کے ساتھ یہی سلوک کر چکی ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کا انعام کس طرح دیا جاتا ہے۔؟

ہر سال ساہتیہ اکیڈمی ملک کے ممتاز ترین ادیبوں، عالموں، پروفیسروں اور ماہرین کو خط لکھ کر ان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ چند ایسی کتابوں کے نام تجویز کریں جو اُن کی رائے میں ساہتیہ اکیڈمی کے انعام کی مستحق ہوں۔ جب یہ نام آجاتے ہیں تو پھر اُن کی ایک فہرست انہی میں سے کچھ منتخب ادیبوں اور عالموں کو بھیجی جاتی ہے اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اُس بڑی فہرست میں سے منتخب کر کے چند ایسی معیاری کتابوں کے نام لکھیں جو ساہتیہ اکیڈمی کے انعام کی حق دار ہوں۔ آخر میں ساہتیہ اکیڈمی دو اعلیٰ ترین ماہرین اور ایک کنوینر (مالک رام) سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ان کتابوں میں سے انعام کے لئے صرف ایک کتاب کا انتخاب کریں۔ اس سال انعام کے لئے تجویز ہونے والی کتابوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر گیان چند جین جیسے بلند قامت ادیبوں کی کتابیں بھی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ جو جج مقرر کئے گئے کیا وہ ایسی بصیرت اور اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ اردو کے ان نامور ادیبوں کی تخلیقات کے بارے میں کوئی فیصلہ دے سکیں؟ یا یہ کہ سارے ملک کے ممتاز ادیبوں اور عالموں نے اتفاق رائے سے جن کتابوں کو ساہتیہ اکیڈمی کے انعام کا مستحق قرار دیا ہے کیا ان کے بارے میں ان ججوں کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہے کہ وہ انعام کی مستحق نہیں اور جن بیسیوں ممتاز ماہرین اور عالموں نے ان کتابوں کو انعام کا مستحق قرار دیا ہے وہ دراصل جاہل اور احمق ہیں؟

ساہتیہ اکیڈمی کا انعام پانچ ہزار روپے کی متعینہ رقم کا انعام ہے جب کہ اردو اکیڈمیاں دس دس ہزار روپے کے انعام دے رہی ہیں۔ لیکن ساہتیہ اکیڈمی کے انعام کی ایک علامتی اور قومی اہمیت ہے۔ اس انعام کے اعلان پر ملک کے اور ساری دُنیا کے ادب دوست یہ جانتے ہیں کہ یہ زبانیں ترقی کر رہی ہیں۔ ان میں اعلیٰ پایہ کا ادب پیدا ہو رہا ہے۔ کیا ساہتیہ اکیڈمی کے ذمہ دار اور جج حضرات اردو والوں کو یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ ڈوگری، کونکنی، میتھلی کشمیری سندھی اور نیپالی جیسی زبانوں میں آج جو ادب پیدا ہو رہا ہے وہ اردو کا عصری ادب کے مقابلہ میں کم بلند پایہ اور وقیع ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اُردو کی کتابوں کو اس قومی انعام سے محروم کرنا ایک بڑی سازش ہے۔ اس سازش کا مقصد دُنیا کو یہ جتانا ہے کہ ہندستان میں اُردو ایک زوال آمادہ زبان ہے۔ اس کے ادیب تخلیقی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس کا مقصد اُردو کے نوجوان ادیبوں میں مایوسی اور پست ہمتی پیدا کرنا ہے۔ انھیں یہ بتانا ہے کہ ملک کی دوسری زبانوں یہاں تک کہ بولیوں میں بھی جو ادب پیدا ہو رہا ہے وہ ان کی تخلیقات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ارفع ہے۔

اس سازش کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کے بعض ذمہ داروں کا تقرر سیاسی پہلو بھی ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کے بعض ذمہ داروں کا تقرر جنتا پارٹی کے عہد حکومت میں ہوا تھا اور سب جانتے ہیں کہ جنتا پارٹی اردو کی دوست نہیں۔ پھر آج یہی ذمہ دار حضرات اردو زبان کو انعام سے محروم کر کے اردو دوستوں اور ساری دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کانگریس کے دورِ حکومت میں اردو اب ان حالوں کو پہنچ گئی ہے کہ اس میں ساہتیہ اکیڈمی کا انعام حاصل کرنے کے لائق ایک کتاب بھی سامنے نہیں ہوتی جب کہ دوسری زبانیں اس کے مقابلہ میں تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ ملک کی دوسری زبانیں ترقی کر رہی ہیں لیکن ہم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اردو کے ادیب اور شاعر بانجھ ہو گئے ہیں اور ان کی کتابیں دوسری زبانوں کی کتابوں کے مقابلہ میں پست اور ادنیٰ درجہ کی ہیں۔

اس صورت حال میں ہم مرکزی حکومت اور ساہتیہ اکیڈمی سے مطالبہ کرتے ہیں کہ

۱۔ ساہتیہ اکیڈمی کے موجودہ اردو کنوینر کو ہٹا کر نئے کنوینر کا تقرر کیا جائے۔

۲۔ ۱۹۸۱ء کے ساہتیہ اکیڈمی انعام کے لئے نئے سرے سے اردو کی کتابوں کے لئے نام مانگے جائیں اور اردو کی کتاب پر انعام دیا جائے۔

(باقی صفحہ ۱۱۳ پر)

خود نوشت

میں جزیرہ نہیں ہوں

خواجہ احمد عباس

ترجمہ: ب ۔ ا

بتایا گیا تھا کہ اگر تم کسی لکیر کو چھوٹا کرنا چاہتے ہو تو اس کے متوازی ایک اس سے بڑی لکیر کھینچ دو مگر اب لوگ دوسری بڑی لکیر کھینچنے کے بجائے پہلی لکیر کو ہی ربر سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید زمانہ بدل گیا ہے۔ مگر مجھے اس طرح کی تبدیلی پسند نہیں میں اپنے جوہروں کو نمایاں کرنا پسند کرتا ہوں اس لئے کہ اس سے ہماری زندگی کی راہیں روشن ہوتی ہیں ہماری بصیرت اور شاید بصارت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اہم حضرات کی سوانح شائع کروں۔ ان پر نمبر نکالوں اور اگر یہ نہ کر سکوں تو کم سے کم ایک مضمون ہی ہر پرچے میں شائع کر دیا کروں۔ خواجہ احمد عباس کی سوانح حیات I AM NOT AN ISLAND اردو میں ابھی تک شائع نہیں ہوئی مجھے یہ کتاب اس قدر پسند ہے کہ کئی بار پڑھ چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہمارے قارئین بھی اس کتاب سے محروم نہ رہیں اس لئے اس کے ایک باب کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں اس میں ۴۹ ابواب ہیں۔ مختلف قسطوں میں اس کا ترجمہ پیش کیا جائے گا۔ اگر لوگوں نے کتابی صورت میں اسے خریدنا پسند کیا تو کتابی صورت میں بھی پیش کیا جائے گا۔

۷ جون ۱۹۷۵ء

آج میں 61 برس کا ہو گیا کلینڈر یہی کہتا ہے اور میرے پاسپورٹ میں بھی یہی درج ہے اور یہی میری پیدائش کے سرٹیفکٹ میں لکھا ہوتا۔ اگر وہ میرے پاس ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فساد میں وہ ضائع ہو گیا۔ گم ہو گیا یا جل گیا۔ اس کے ساتھ دوسری کئی چیزیں اور یادیں بھی جو میری پیدائش سے وابستہ تھیں جل گئیں۔ ۳۰ ہزار مسلمانوں کو پانی پت چھوڑ کر ایک نئے اور اس وقت نسبتاً ایک اجنبی دیار۔ پاکستان ہجرت کرنا پڑا۔

مگر میرا خاندان ہندستان چھوڑنے پر تیار نہ تھا مگر چونکہ مقامی پولس انھیں پانی پت میں ٹھہرنے نہیں دیتی تھی وہ میرے پاس بمبئے آنے پر تیار ہو گئے یہاں میں بے چینی سے اُن کا منتظر تھا۔ یہ جواہر لال نہرو کی ہمدردی اور انسانیت تھی کہ انھوں نے مسلح حفاظتی دستے کے ساتھ ایک ٹرک بھیج کر انھیں دہلی بلوا لیا۔ میری ماں بہنوں کی عزت اور زندگی بچ گئی مگر چونکہ انھیں آدھی رات کو پانچ منٹ کی مہلت پر گھر چھوڑنا پڑا تھا اس لئے سارا اثاثہ وہیں چھوڑنا پڑا۔

ہم کبھی امیر و کبیر نہ تھے اس لئے جہاں تک زر و مال کا تعلق ہے کچھ زیادہ نہیں گیا مگر کپڑوں سے بھرے ٹرنک تھے ان میں میری ماں کا عروسی جوڑا بھی تھا۔ بستر، چٹائیاں، چادریں اور تکیوں کا انبار تھا اس لئے کہ ہمیشہ ہمارے یہاں مہمان بہت آتے تھے۔ ایک پورا کمرہ کتابوں سے بھرا تھا۔ موٹی، چمڑے کی جلد والی قانون کی کتابیں تھیں اس لئے کہ بڑے چچا وکیل مقنن اور صحافی تھے۔ ایک پوری لائبریری مذہبی کتابوں سے پُر تھی اس لئے کہ میرے دوسرے چچا عربی فارسی کے عالم اور اسلامی تاریخ اور فقہ پر سند تھے۔ مولانا آزاد کے ہلال کی جہازی سائز خستہ حال جلدیں تھیں جن کو میرے والد نے بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا تھا میری اپنی اسکول کالج کی نصابی کتابیں تھیں جنھیں میں کبھی جدا نہ کر سکا اور آئرلینڈ، اٹلی اور روس کے بارے میں انقلابی تحریریں تھیں جن کو میں نے کالج کے زمانے میں کچھ سمجھ کر اور کچھ سمجھے بغیر ہی چاٹ ڈالا تھا۔ سلور کپ اور گولڈ میڈل سے پورا ریک بھرا تھا یہ کھیل کا انعام نہیں تھے بلکہ لفظی دنگل کا نتیجہ تھے جو ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے پلیٹ فارموں پر حاصل کئے گئے تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کی بی اے کی فریم شدہ ڈگری تھی، ایک ٹرنک میں پرانے خاندانی دستاویز تھے ان میں زردی مائل شجرہ نسب بھی تھا جن کا سلسلہ آدم و حوا سے مل جاتا تھا میرے والد نے بچوں کی پیدائشی سرٹیفکٹ بڑی احتیاط سے رکھے تھے۔

ان کی موت کے بعد سے کسی نے اس زنبیل کو نہیں چھیڑا تھا مگر میں جانتا تھا کہ جب ضرورت ہوگی پیدائش کا سرٹیفکٹ امید کی کرن کی طرح صندوق کی تہہ میں رکھا مل جائے گا۔

مگر جب میں پانی پت جا کر اپنے گھر کے کھنڈرے کچھ لینے کے قابل ہوا تو مجھے خستہ دیواروں سے کچھ قابل قدر چیز نہ مل سکی۔ البتہ نصف درجن فیملی فوٹوگراف اور کالج گروپ کے فوٹو مل گئے اور چھت والے پنکھے کا آہنی چھڑ بھی موجود تھا۔ باقی سب کچھ جا چکا تھا مفید چیزیں لوٹ لی گئی تھیں اور غیر مفید جیسے کتابوں اور کاغذات کے ذخیرے جلا دیے گئے۔

تاہم میں سارے گھر میں بے مقصد گھومتا پھرا۔ کسی چیز کی کوئی خاص تلاش نہ تھی شاید میں اپنی یادوں کی پرچھائیاں تلاش کر رہا تھا۔ کسی زمانے میں یہ وسیع برآمدہ نما دالان تھا جہاں شدید گرمیوں میں بھی روئی بھرے موٹے پردے پڑے رہتے تھے میں آدھی رات کو یہیں پیدا ہوا تھا۔ اس کی چھت پر میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ یہاں ایک ٹیبل تھا جس پر

میں اور میری بہن اپنا ہوم ورک کرتے تھے اور جب اس کے نیچے کھیلتے تھے تو یہی ٹیبل ریل کا ڈبہ بن جاتا تھا یا رانی کا گھوارہ، یا ڈاکوؤں کا غار جہاں علی بابا لفظ کھل جا سم سم، کہا کرتا تھا۔ میں تہہ خانہ میں بھی گیا۔ سیلن اور سوندھی سوندھی بو سے معمور تہہ خانہ جہاں گرمیوں کے لمبے دن سو کر گزارتا تھا۔ اس نیم تاریک تہہ خانے میں معلوم ہوتا تھا کہ وقت تھم گیا ہے۔ مگر تبھی کسٹوڈین والے کو بے چینی محسوس ہوئی اور مشکوک ہو کر اس نے پوچھا تہہ خانے میں کیا تلاش کر رہے ہو

اگر میرا مزاج شاعرانہ ہوتا تو میں ٹھنڈی سانس لے کر کہتا "میں یہاں اپنا گم شدہ بچپن اور جوانی کے دن ڈھونڈ رہا ہوں"، مگر میں بس اتنا ہی کہہ سکا "شاید مجھے اپنی پیدائش کے سرٹیفکٹ کی تلاش ہے"۔

اور حقیقتاً مجھے ان دنوں سرٹیفکٹ کی شدت سے تلاش تھی اس لئے کہ مجھے پاسپورٹ بنوانا تھا۔ میں نے یہ پاسپورٹ بنوا بھی لیا اس کے لئے حلف نامہ داخل کرنا پڑا، مگر بعد میں اسے مرارجی ڈیسائی (اس وقت بمبئی کے وزیر داخلہ تھے) کے حکم سے ضبط کر لیا گیا۔ مگر پھر مجھے واپس کر دیا گیا۔ آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ کس شخص کی مداخلت پر مجھے پاسپورٹ واپس ملا۔ جی ہاں جواہر لال نہرو۔ مگر یہ تو بہت بعد کا واقعہ ہے اس وقت کی بات تو یہ ہے کہ پیدائش کے سرٹیفکٹ کی عدم موجودگی کی وجہ سے میں قانونی طور پر پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس پیدائش کی سند موجود ہوتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مجھ پر بڑا اثر ہوتا اور مجھے یقین کرنا پڑتا کہ میں 61 سال کا ہو گیا ہوں اور مجھے یہ یقین کرنا ناگوار ہے کہ میں 61 سال کا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں جنم دن منانا پسند نہیں کرتا اور خاص طور پر اپنا جنم دن۔

جنم دن ٹھیک ہے مگر ان لوگوں کے لئے جو جوان ہیں اور جن کو یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ اب وہ بڑے ہوتے جا رہے ہیں چاہے وہ بہتر نہ ہو رہے ہوں۔ مگر ہر جنم دن بڑی بے دردی سے یاد دلاتا ہے کہ آدمی اپنی زندگی کی آخری منزل کی طرف گامزن ہے

جنم دن مالی سال کے خاتمہ کی طرح ہے جب انکم ٹیکس کے محکمہ کی طرف سے آپ کو رجسٹرڈ خط ملتا ہے آپ چند دنوں کے لیے اس خط کو نظر انداز کر سکتے ہیں مگر اس سے جان نہیں بچا سکتے دیر یا سویر آپ کو انکم ٹیکس ریٹرن تیار کے داخل کرنا پڑے گا۔ ہر ایک جنم دن پر آپ کی اپنی زندگی کا بیلنس شیٹ (موازنہ) بنانا پڑے گا اور خدا یا ضمیر کے حضور میں پیش کرنا پڑے گا۔

نقصان والے حصے کا تخمینہ لگانا آسان ہے۔ 61 برس یہ خرچ ہے جو کیا گیا۔ مگر نفع والے حصے میں کیا دکھانے کو ہے؟ تحریروں کا انبار جو زردی مائل اخباروں کی فائل میں دفن ہو گیا۔ آج پڑھا جاتا ہے اور کل بھلا دیا جاتا ہے۔ تین درجن کتابیں لکھی ہیں مگر ۲۰ برس بعد ان میں سے کتنی یاد رہیں گی؟ ان میں زیادہ تر کو کیا ناقدوں نے اپنی طرف سے ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینک دیا؟ ایک درجن فراموش شدہ فلم جو ڈسٹری بیوٹروں کے گوداموں میں گرد آلود ہو رہی ہیں۔ گودام سلولائڈ قبرستان جہاں ہٹ سے ہٹ فلمیں اور مشہور سے مشہور شاہکار چند دنوں تک پردہ سیمیں پر اپنی جھلک دکھا کر دفن ہو جاتی ہیں۔

اور کیا اثاثہ ہے میرے پاس جسے ڈکلیر کیا جائے

مگر ہر ایک کے پاس اثاثہ ہوتا ہی ہے، اور زندگی آخر کار سرمایہ دارانہ نظام کی قدروں اور روایات سے تو چلتی نہیں جہاں ہر ایک کو اپنی کامرانیاں منافع کی طرح ڈکلیر کرنا پڑتا ہے۔ کیا زندگی بذات خود زندگی کا معنی و منتہا نہیں ہے؟ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی زندہ رہا 61 سال جیا پوری طرح بہترین جذبات کا حامل رہا اپنے زمانے کے ہیجان انگیز واقعات کا شاہد رہا اور جہاں تک ہو سکا انسانی وجود کے اس عظیم ترین ڈرامہ میں شریک ہوا؟

اپنے ملک اور اپنی دنیا کے تاریخی ترقیات کے مشاہدہ کے معاملہ میں واحد خوش قسمت رہا ہوں میں نے ساحل سمندر جوہو پر چرخہ کاتتے ہوئے مہاتما گاندھی کے ساتھ گفتگو کی ہے مجھے جواہر لال نہرو کو سننے ان سے باتیں کرنے کے بہت مواقع ملے ہیں ان کو کام کرتے دیکھا آرام کرتے دیکھا شملہ پر گھڑ سواری کرتے دیکھا پانڈوں کو کھلاتے دیکھا ہزاروں لاکھوں جلسوں کو خطاب کرتے دیکھا ناراض ہوتے دیکھا غصے کی حالت میں دیکھا اور ایک بچارے بیمار کارٹونسٹ کو دودھ دیتے دیکھا ہے حالانکہ چند ہی منٹ پہلے اس نے نہرو کے مشہور غصے کو بھڑکا دیا تھا یہ کہہ کر کہ دس بجے تک بیٹھ کر اسے تصویر اتارنے کی اجازت دی جائے اس لیے کہ تین روپے حاصل کرنے کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی۔ میں نے سروجنی نائیڈو کو سننے کی مسرت حاصل کی ہے انہیں اپنی نظمیں پڑھتے سنا ہے۔ اور مولانا آزاد کے یہاں 5 بجے صبح بغیر چینی کی یاسمین چائے پینے کا نادر موقع بھی مجھے ملا ہے مولانا سے صرف 5 بجے ہی انٹرویو لینے کا موقع مل سکتا تھا۔

میں دنیا بھر میں گھوما پھرا ہوں سوویت یونین کے درجن پھیرے کیے ہیں اور اسٹالن سے پہلے کے عہد میں برف پگھلتے اور پھول کھلتے دیکھنے کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ میں نے غلط سلط روسی بول کر نکیتا خروشچیف کو ہنسایا ہے اور خلا میں تاریخ ساز اڑان کے فوراً بعد ہی میں نے گگارین سے باتیں

کی ہیں۔

میں نے بڑے غلام علی خان، بونکار ٹھاکر اور سبالکشمی کے سنگیت سنے ہیں جوش، نرالا، سمترا نندن پنت اور ایوتیشنکو اور فیض سے ان کا کلام سنا ہے بے مثال اولانور کو بالشوئی تھیٹر کے اسٹیج پر میں نے جولیٹ کھیلتے دیکھا ہے۔ دیونکی اور ایم برانٹ اور ایفل اور پکاسو کی بنائی ہوئی تصویریں پیرس کی لوورے میں اور لینن گراڈ کی ہرمٹیج میں دیکھی ہیں۔ میں نے حسن ساکن اور حسن عمل دیکھا ہے حسن فطرت اور حسن انسان دیکھا ہے اور انسان کا تخلیق حسن بھی حسن جسے زمانے نے کھوکھلا کر دیا اور حسن عہد حاضر بھی۔

میں نے تاج اور اجنتا دیکھا ہے اور آرکو پوس اور پارتھیون بھی گلمرگ کشمیر کے گلزاروں میں پھرا ہوں اور ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی لفٹ پر چڑھ کر رات کو نیویارک کے بے حد طلسماتی پنورما کا نظارہ کیا ہے۔

میں نے سارناتھ میں بدھ کے چہرے کا سکون دیکھا ہے اور مونالیزا کی غمگین مسکراہٹ بھی عیسی کے ساتھ دکھ جھیلے ہیں اور چارلی چیپلن کے ساتھ اس کے غم ناک طربیوں پر ہنسا ہوں۔ بھگت سنگھ کی پھانسی کی خبر سن کر اپنے دوسرے ساتھی طلبا کے ساتھ دکھ سے چلایا اور رویا ہوں اور 15 اگست 1947 کو آزادی کے دن سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے ساتھ مل کر بمبی کی سڑکوں پر مسرت سے ناچا اور چلایا ہوں۔

ان سب کا میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ دیکھا ہے تجربہ کیا ہے احساس کیا ہے یہ سب میرے اندر ہیں سب میرے جزو ہیں اور میں ان سب کا جزو ہوں جو میں نے دیکھا، تجربہ کیا اور محسوس کیا۔ دنیا نے مجھے بنایا اور میں نے دنیا کو (کم سے کم — 4000000000واں جزو) میں انسانیت کا حصہ ہوں اور انسانیت میرا حصہ ہے جیسا کہ بیج درخت سے جنم لیتا ہے اور درخت بیج کا ثمرہ ہے۔

کیا سچ مچ میں 61 سال کی عمر کا ہوں؟ فرض کیا میں 61 برس کا ہوں۔ مگر واقعی مجھے ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ جب میں ڈاڑھی بناتے ہوئے آئینہ دیکھتا ہوں صاف چندیا کے گرد سفید ہوتے ہوئے بالوں کی جھالر والا آدمی تھکی آنکھوں سے گھورتا نظر آتا ہے۔ میں اس اجنبی کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہوں گرچہ اس کا چہرہ شناسا لگتا ہے۔ ممکن نہیں کہ یہ میں ہوں۔

میں لافانی شباب کا دعویدار نہیں ہوں جو کہ جواہر لال نہرو کو حاصل تھا۔ میں ان سے آخری بار ان کی موت سے ایک مہینہ تین دن پہلے ملا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 75 برس تھی مگر وہ 60 سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ اور جب وہ مسکراتے تھے تو اور کم عمر نظر آتے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں 61 برس کا لگتا ہوں شاید اس سے بھی زیادہ عمر کا معلوم ہوتا ہوں مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے ایسا محسوس نہیں ہوتا۔

مجھے یاد ہے کہ 50 سال کی عمر میں ہی میرے والد اپنے بارعب کھچڑی ڈاڑھی کے ساتھ اپنے شہر کے بوڑھے بزرگ تسلیم کر لیے گئے تھے اور دانشمندانہ صلاح و مشورہ کے لیے لوگ ان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ محلے کے بچے ان کو دادا کہا کرتے تھے۔ اگر میری کوئی پوتی یا پوتا مجھے دادا کہہ کر پکارتا ہے تو مجھے فطرتاً صدمہ ہوتا ہے۔ میں نہیں چاکلیٹ اور مٹھائیوں کی رشوت دیکر چچا کہلوانا چاہتا ہوں گرچہ میں اسے ترجیح دوں گا کہ وہ مجھے بڑا بھائی کہیں۔

پتہ نہیں فخر کی بات ہے یا شرم کی مگر میں ایک طرح ایسا بچہ ہوں جو بڑھنا ہی نہیں چاہتا۔ میں 61 سال کا ہو گیا ہوں مگر دانشمندی، وقار، متانت، پختگی فیصلہ، منصفانہ اظہار یا ادبیاتی ذوق جو عام طور پر عمر کے ساتھ بڑھتی ہے مجھ میں نہیں آئی۔

فلمی ناقد کی حیثیت سے میں نے دس برسوں میں تقریباً تین سو فلمیں دیکھی ہیں۔ اس دوران درجن بھر اچھی بری اور بس یونہی سی فلمیں لکھی، ہدایت کی اور تخلیق کیں۔ میں اس فلم سوسائٹی کا بانی اور صدر ہوں جو دنیا کی بڑی اعلیٰ فلمیں دکھاتی ہے پھر بھی شام سے زیادہ محظوظ ہونے کی غرض سے شہر کی سب سے احمقانہ فلم دیکھنا چاہتا ہوں اور جوان دوستوں کے گروہ کے ساتھ وہاں جاتا ہوں اور بالکنی کے ریلنگ پر پاؤں پسار کے غل مچا کر مونگ پھلی اور پکوڑا کھاتا ہوں، عریاں مناظر پر شور مچا کر اور بے مواقع اور محل داد دیکر آگے بیٹھنے والوں کی نقل اتارتا ہوں۔

انحطاط پذیر ذہنی ترقی کی شاید ایک علامت یہ بھی ہے کہ اب بھی خوبصورت چہرے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ اب بھی میں چلتی بسوں اور گاڑیوں میں کودنا چاہتا ہوں جب کسی جہاز پر سیٹیں مخصوص نہ ہوں تو میں دوڑ کر سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھنا چاہتا ہوں صحافی اور ادیب کی حیثیت سے صدی سے زیادہ کی اپنی زندگی میں کم سے کم 60 لاکھ الفاظ میرے نام سے ضرور ہی چھپے ہیں مگر اب بھی اپنا نام چھپا دیکھ کر جھوم جاتا ہوں۔ ہر جمعرات کی صبح اخباروں کا شور مجھے اٹھاتا ہے اور میں تیزی سے بھاگ کر بلٹز اٹھاتا ہوں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ واقعی میرا آخری صفحہ اس میں چھپا یا نہیں۔ اب بھی میں اپنی کتابوں

اور اپنی فلموں کا سب سے بڑا خریدار ہوں جب 1935 میں سب سے پہلے کہانی شائع ہوئی تو میں نے سب سے زیادہ جلدیں خریدی تھیں اسی طرح جب 1938 میں میری پہلی کتاب چھپی پھر جب 1941 میں میری پہلی فلم چلی تو میں نے سب سے زیادہ تھوک میں ٹکٹ خریدے اور آج بھی یہی حال ہے۔

اس طرح کا مغالطہ میرے خیال سے کافی بے ضرر ہے۔ میں اس فریب کے ساتھ جینا سیکھ چکا ہوں جیسے کہ میں نے اپنے پستہ قد کو تسلیم کر لیا ہے۔ دوسرے اکثر حیران ہوتے ہیں کبھی الجھتے ہیں ایک آدھ بار مایوس بھی ہوتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ میں اس وقار و متانت سے کام نہیں لیتا جو اس عمر کا تقاضا ہے۔ میں نے اپنا کبھی نفسی تجزیہ نہیں کرایا مگر ایک ضرورت سے زیادہ پڑھی لکھی خاتون نے ایک بار مجھ سے کہا کہ میں ایک قسم کے جذباتی طفلانہ فالج میں مبتلا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا خیال صحیح ہو اسے نہیں معلوم تھا کہ 19 سال کی عمر میں مجھے ایک جذباتی صدمہ پہنچا تھا جس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ اس کی وجہ سے رنج و مسرت کا احساس مجھ میں شدید ہو گیا اس کی وجہ سے میں روایت پرستانہ قدروں اور ضابطہ اخلاق سے بغاوت کرتا ہوں اس نے میرے تصورات کو چیلنج کیا اور اس کی وجہ سے میرے اندر پوشیدہ تمام قوت اظہار بیدار ہو گئی۔ اس نے مجھے مشکک، لاادری اور سوشلسٹ بنا دیا۔ اس نے مجھے مصنف، اور دنیا کے آخری کناروں تک بھاگنے کا مضطرب مسافر بنا دیا اور ان سبھی اسباب کا حلیف جو نئے معاشرے کی نئی قدروں کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ مگر میرے اندر جذبات کا وہ آخری لمحہ منجمد ہو گیا، مرا نہیں یہ ایک حرکی تصویری ڈھانچ کی طرح جم گیا جو اچانک منجمد ہو جاتا ہے۔ احساسات اور 19 سال کے جذباتی ردعمل بالکل ویسے ہی رہ گئے گرچہ سال گزرے اور اپنے بے رحم نشانات چہرے اور جسم پر چھوڑ گئے۔ صرف دل نے بوڑھا ہونے سے انکار کر دیا۔ آپ اسے فالج کہیں، موت کہیں چاہے کچھ اور مگر یہ بھی زندگی ہے۔ عقیدہ ہے وفاداری ہے اور یہاں تک کہ ایک طرح کی جاودانی ہے۔

یہ غالباً سچ ہے مگر چند دوسری سچائیوں کی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مکمل سچائی نہ ہو ممکن ہے اس کے چند اور اسباب بھی ہوں کیونکہ 61 برس کی عمر میں مجھ میں وہ وقار اور دبدبہ نہیں ہے جو اس عمر میں میرے والد میں تھا۔

میں انوکھا بننے کی کوشش کیوں کرتا ہوں؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ پوری دنیا جوان تر ہوتی جاتی ہے؟ کیا یہ جذباتی فالج نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ ہوتا ہے مگر دواؤں کے اثر نے کام کیا ہے۔ 50 برس پہلے اوسط ہندستان کی عمر 27 سال ہوتی تھی اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ 50 کے بعد آدمی یہ سمجھتا تھا کہ وہ مانگے کی زندگی گزار رہا ہے اور اس کا ایک پاؤں قبر میں ہے۔ آج اوسط عمر اس زمانہ کے مقابلہ میں دوگنی سے زیادہ ہے اور گزشتہ 50 برسوں میں کم سے کم تین ممتاز ہندستانیوں نے اپنی صد سالہ جشن منائی ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں اب بھی ریٹائرمنٹ کی عمر 55 سال ہو سکتی ہے مگر ہمارے یہاں بہت سے لوگ ہیں جو 70 سال سے زیادہ کی عمر کے باوجود سرگرم سیاست، کاروبار، ادب اور فنون میں حصہ لیتے ہیں اس دنیا میں جہاں سرگرم معمر موجود ہیں 60 یا 61 سال کے آدمی کے لئے اب یہ سوچنا ضروری نہیں کہ وہ زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے۔

جو پیشہ یا پیشے میں نے اختیار کئے ان کی وجہ سے بھی میں بوڑھا ہونے میں ناکام رہا۔ (یا یہ کہنا چاہئے کہ جوان محسوس ہوتے رہنے میں کامیاب رہا)

ٹیچروں اور پروفیسروں کو تو بوڑھا ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ ان کے طلبا انھیں سنجیدگی سے نہیں لیتے یہی حال جوان لگنے والے سیاست داں کا ہو سکتا ہے جواہر لال نہرو ایک استثنیٰ تھے عمر کی وجہ سے عالم، مصلح، وکیل، اور بلاشبہ "لیڈر" میں جو کہ ہمارے ملک میں اب ایک پیشہ بن گیا ہے، امتیاز اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ ان پیشوں کے جوان لوگ بھی اپنے حلئے اور رویئے سے تجربہ اور دانش کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ان کے کاروبار کا گر ہے۔

دوسری طرف انجینیر اور سائنس دان اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ہی پُرشباب ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسا اس لئے ہوتا ہو کہ وہ ڈائنامک ... حقائق سے ربط رکھتے ہیں وہ مستقبل سے واسطہ رکھتے ہیں۔ ایک 70 سالہ فلسفی ایک 50 سالہ شاعر کی بہ نسبت بوڑھا ہوتا ہے اس لئے کہ فلسفی دانش حاصل کرتا ہے جو کہ عمر کا اجارہ ہے اور شاعر اپنا تخیل چمکا رہا ہے جو کہ جوان کا اختیار ہے۔ جنگ بازی ہوا بازی خلا بازی کوہ بازی یہ سب پُرشباب پیشے ہیں۔ صحافت بھی ایسا ہی ہے یہ پیشہ میں نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف چنا تھا وہ چاہتے تھے کہ میں یا تو ڈاکٹر بنوں یا انجینیر یا کم سے کم وکیل۔

صحافت بھی (چاہے اس کے حق یا مخالفت میں کچھ بھی کہا جائے) جوان آدمی کا پیشہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ صحافی ہمیشہ تیزی سے تغیر پذیر واقعات عالم کا مرکز ہوتا ہے جو خبر کے دائرے میں آتے ہیں یا ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ صحافی اعصابی انگیخت کی فضا میں کام کرتا ہے اسے تیزی سے بھاگتے ہوئے وقت کے ساتھ دوڑ لگانا پڑتا ہے اسے ہمیشہ کریدگی

رہتی ہے اور ایک طرح کا جذبہ جہاد صحافی کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ نہ صرف اسے واقعات کی روداد پیش کرنی چاہئے بلکہ نقاب کشائی اور وار بھی کرنا چاہئے اس لئے صحافت کا پیشہ اضطراب اور پُرشباب تیزی و تندی سے بھرپور ہوتا ہے۔ صحافی کے پاس بوڑھا ہونے کا وقت نہیں ہے۔ جب بھی میں اپنے پہلے ایڈیٹر اور گروجے این ساہنی سے ملتا ہوں ان کی پُرشباب توانائی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ان کا ذہن آج بھی بہت تیز اور واضح ہے اور اختیار و اقتدار کے تئیں ان کا جذبہ تضحیک و جہاد کبھی بھی دبایا نہ جا سکا۔ ایک بار میں نے ان سے ان کی سدا بہار جوانی کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا۔ وہی سبب ہے جو تمھاری جوانی کا ہے یعنی صحافت۔

ادب کے مقدس شعبہ میں اور فلم کی لطیف دنیا میں بھی میری کہانیوں کو صحافت کا پرتو کہا جاتا ہے اور رد کیا جاتا ہے۔ ادبی اور فلمی نقاد میری کتاب یا فلم کو دیکھے بغیر ہی اسے صحافت کہہ کر ٹال دیتے ہیں ایک صاحب نے تو جرنلزم یعنی صحافت کا تلفظ کرتے وقت اسے اس قدر کھینچ کر پڑھا کہ جرنلیز چیز کا ہم وزن نظر آنے لگا۔ صحافت ارباب فلم کے نزدیک گالی کے مترادف تھی مگر چند فرانسیسی اخبار والوں نے فلمی دنیا میں آکر اپنی نئی لہر کی فلموں سے ایک جوت جگادی۔

ذاتی طور پر میں نے صحافت اور ادب سے خفیف سے امتیاز کی کبھی پرواہ نہیں کی اور نہ ہی صحافتی فلم اور فنی فلم میں امتیاز کی فکر کی پینٹنگ میں حقیقت نگاری کا کبھی "رنگین فوٹوگرافی" کہہ کر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اور ادب میں "حقیقت نگاری" کو صحافت کہہ کر مسترد کر دیا جاتا تھا یہی حال فلم کا بھی تھا۔ مگر اچھی "تخیل انگیز، تحرک پذیر صحافت بھی۔ حقیقت پسند عصری ادب سے الگ نہیں رہی۔ ایک خصوصی نمائندہ ہوا کرتا تھا جسے کارل مارکس کہتے ہیں وہ نیویارک ہیرالڈ ٹریبیون کو اپنی تحریریں بھیجا کرتا تھا آج وہ تحریریں کمیونزم کی یادگار ہیں۔ ہیمنگ وے اور اسٹین بیک دونوں نے اپنے شاہکار اپنی صحافتی سرگرمیوں کے دوران تخلیق کئے۔ اسٹین بیک نے گریپس آف رتھ لکھا جب کہ وہ عظیم انحطاط کے اسباب کی چھین بین کی صحافتی ذمہ داری پوری کر رہا تھا اور ہیمنگ وے نے فار دی وی میں بیل ٹولس اس زمانہ میں لکھا جب وہ اسپین کی خانہ جنگی سے خبریں بھیج رہا تھا (اور جنگ میں شریک بھی تھا)

فلم بھی اپنی ابتدا میں اور اپنی ترقی یافتہ مرحلہ میں بھی صحافت سے غیر متاثر نہیں رہی۔ ابتدائی فلمیں نیوز ریل ہونے کی وجہ سے محض سلولائڈ صحافت تھیں۔ خبریں پردہ فلم پر دکھائی جاتی تھیں۔ پہلی اہم خاموش فلم جو ہندستان میں بنی۔ وہ نیوز ریل اور ڈکومینٹری فلم تھی جو تقسیم بنگال پر قومی احتجاج کے موضوع پر بنی تھی۔ آرلسٹک فلم کے عظیم پیامبر جن کی لوگ قسمیں کھاتے ہیں بسم اللہ کے گنبد میں رہنے والا کوئی تجدید پسند نہ تھا بلکہ صحافی پمفلٹ بار اور سیاسی پوسٹر بنانے والا تھا اس کا نام تھا سرگئی آئن اسٹائن اس نے اپنی فلم بیٹل شپ پوٹمکن کے ذریعہ فلمی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اٹلی میں میکسیگلو انٹونیونی مختصر افسانے لکھتا تھا۔ اخباروں میں مضامین لکھتا تھا فلموں پر تنقید لکھتا تھا فلم کی ہدایت کاری تو اس نے بعد میں شروع کی۔ فرانس میں نوجوان صحافیوں کا پورا جرگہ ہے جو فلم کی تاریخ سازی کر رہا ہے۔

فلم اور صحافت دونوں میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔ دونوں کا زندگی سے تعلق ہے۔ فلم ساز اور صحافی دونوں کو بڑے سامع اور ناظر کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا چیلنج قبول کرنا پڑتا ہے اور اس طرح کہ سامعین اور ناظرین اس کے لئے معاوضہ بھی ادا کریں۔ دونوں غیر روائتی بلکہ لاابالی طرز زندگی اختیار کرتے ہیں جو کہ کسی کلرک، فوجی افسر موچی یا صنعت کار کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ دونوں کو اظہار یا تخلیق سے ایک ہی طرح کی مسرت ہوتی ہے۔ دونوں کو مالی جوکھم اور پیشہ ورانہ غیر یقینی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے اور دونوں کو لمحہ بہ لمحہ جینے کی اذیت اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ غالباً اسی لئے یہ جوان رہتے ہیں۔ ۵۲ سال کا بوڑھا ہیرو اپنے سے آدھی عمر کی ہیروئن اداکارہ کے ساتھ عشقیہ منظر میں نظر آتا ہے اور وہ ۶۵ سال کا بوڑھا اخباری نمائندہ ہوائی جہاز سے اڑکر جنگ، انقلاب، زلزلہ یا چوٹی کانفرنس کی خبریں حاصل کرتا پھرتا ہے۔

صحافی، مصنف، فلم اداکار، ہدایت کار، فلم ساز کے لئے وظیفہ لے کر ریٹائر ہونے کی کوئی عمر نہیں ہے۔ صحافی اور فلم ساز میں ایک چھوٹا سا فرق ہے۔ اداکار اور (اداکارہ) اپنی پیدائش کے سرٹیفکٹ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اور صحافی کو نہ ضرورت پڑتی ہے اور نہ اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ اپنا سرٹیفکٹ دیکھے۔

رشید احمد شروانی

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے بارے میں ٹھوس معلومات پر مبنی مضامین کا سلسلہ رشید احمد شروانی صاحب نے شروع کیا ہے۔ ان کے مضامین عام طور پر ہفت روزہ اور روزنامہ اخباروں میں شائع ہوتے ہیں مگر ان مضامین کی نوعیت وقتی یا ہنگامی نہیں ہوتی۔ ان کی ایک مستقل حیثیت اور اہمیت ہے۔ یہ آج بھی بامعنی ہیں اور بہت حد تک کل بھی بامعنی ہوں گے۔ مگر اردو میں ہفت روزہ اور روزنامہ اخباروں کا سائز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آسانی سے محفوظ رکھا جا سکے۔ چنگاری کا سائز ایسا ہے کہ اُسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے رشید صاحب کے اہم مضامین کو ہم "چنگاری" میں شائع کر رہے ہیں۔

ہم نے شمس پور کے ضلع بورڈ اردو میڈیم پرائمری اسکول کی بابت لکھا تھا کہ وہاں مسلم بچوں کی تعلیم اچھی طرح ہو رہی ہے۔ اس کے بالکل قریب گاؤں چرولہ ہے جہاں (ہمیں بتایا گیا کہ) کل آبادی قریب دو ہزار ہے جن میں قریب ایک ہزار مسلمان ہیں۔ یہاں ضلع بورڈ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب عبدالعزیز صاحب ہیں۔

۱۹۸۱ء کے سالانہ امتحانات کے رزلٹ سے پتہ چلا کہ پانچویں کلاس کے سالانہ امتحان میں چھ غیر مسلم بچے شریک ہوئے اور صرف ایک مسلم بچہ شریک ہوا۔ فرسٹ بریندر سنگھ نے پچاس روپے، سکنڈ بال کشن نے بیس روپے اور تھرڈ رام چندر نے بیس روپے انعام جیتا۔

چوتھی کلاس کے امتحان میں دس غیر مسلم اور صرف دو مسلم بچے شریک ہوئے۔ فرسٹ خیر سنگھ، سکنڈ راج بہادر، تھرڈ ستیہ پرکاش۔

تیسری کلاس میں چوالیس غیر مسلم اور صرف تین مسلم بچے شریک۔ فرسٹ سنتوش کمار، سکنڈ مکیش چند اور تھرڈ کماری منجولتا۔

دوسری کلاس میں پینتیس غیر مسلم اور صرف چار مسلم بچے شریک۔ فرسٹ سکھ دیو، سکنڈ ارجن اور تھرڈ گجراج سنگھ۔

پہلی کلاس میں چالیس غیر مسلم اور گیارہ مسلم بچے شریک۔ فرسٹ افضل خاں، سکنڈ قیصر علی اور تھرڈ پوزیشن دو بچوں نے حاصل کی، ستیاس اور رام پھل۔ یعنی جس ایک کلاس میں مسلم بچے قابلِ لحاظ تعداد میں ہیں وہ پوزیشن بھی لاتے ہیں۔

پہلی سے چوتھی کلاس تک فرسٹ نے پچیس ۲۵، سکنڈ نے پندرہ ۱۵ اور تھرڈ نے دس روپے کے انعامات جیتے۔ اس اسکول میں سب بچے پاس ہوئے۔

جس گاؤں میں آدھی آبادی مسلمانوں کی ہے وہاں اسکول میں کل ایک سو چھپن بچوں میں صرف اکیس ۲۱ مسلم بچے ہیں جو کہ چودہ فیصد بھی نہیں۔ بہر حال چونکہ پہلی کلاس میں مسلم بچوں کی تعداد کچھ بڑھی ہے اور امید ہے کہ اس سال مزید بڑھے گی اس لئے ہم اس اسکول کو اپنی اسکیم میں شامل رکھ رہے ہیں۔

اگر مسلم بچوں کی تعداد نہ بڑھی تو ہمیں نظر ثانی کرنی ہو گی۔

پچھلے سال اگست ۱۹۸۰ء میں ہم کو اطلاع ملی تھی کہ پہلی کلاس میں آٹھ مسلم بچے ہیں مگر سالانہ امتحان ۱۹۸۱ء تک گیارہ ہو گئے یعنی تین بڑھ گئے۔ دوسری کلاس میں پانچ مسلم بچے تھے مگر سالانہ امتحان صرف چار نے دیا۔ ایک کم۔ تیسری کلاس میں تین بچے تھے۔ تینوں نے سالانہ امتحان دیا۔ چوتھی میں تین تھے، سالانہ امتحان تک ۲ دو رہ گئے۔ ایک کم۔ پانچویں میں ایک مسلم بچہ تھا اور اس نے سالانہ امتحان دیا۔ یعنی اس گاؤں میں پانچ کلاسوں میں دو مسلم بچوں نے بیچ میں پڑھائی چھوڑی۔

پچ پوکھرہ ضلع ایٹہ کا ایک گاؤں ہے جہاں سوا تین ہزار لوگوں میں سے قریب تین ہزار مسلمان ہیں۔ یہاں ضلع بورڈ کے پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر حفیظ الرحمٰن صاحب ہیں۔

اس اسکول میں سالانہ امتحان ۱۹۸۱ء میں پانچوں کلاسوں میں ملا کر صرف تریسٹھ بچے شریک ہوئے۔ پچپن مسلم اور آٹھ غیر مسلم۔

پانچویں کلاس میں نو مسلم بچے (آٹھ لڑکے اور ایک لڑکی) شریک۔ سراج النبی فرسٹ، محمد حسرت سکنڈ اور سلطان نبی تھرڈ۔

چوتھی کلاس میں ایک غیر مسلم اور چھ مسلم لڑکے شریک۔ نزاکے فرسٹ، جعفر علی سکنڈ اور ذکی عالم تھرڈ۔

تیسری کلاس میں دس ۱۰ مسلم اور چھ غیر مسلم لڑکے شریک۔ یار محمد فرسٹ۔ سنجے سکنڈ اور شمس الحسن تھرڈ۔ دس مسلم لڑکوں میں سے چھ یعنی ساٹھ فی صد پاس چھ ۶ غیر مسلم لڑکوں میں سے پانچ یعنی چوراسی فیصد پاس۔ باقی تمام کلاس میں سو فی صد پاس۔

دوسری کلاس میں ایک غیر مسلم اور نو مسلم لڑکے شریک۔ حسرت علی فرسٹ، اکبر علی سکنڈ اور بھورے خاں تھرڈ۔

پہلی کلاس میں اکیس ۲۱ مسلم لڑکے شریک۔ محمد نبی فرسٹ، شفیع عالم سکنڈ اور مشیر احمد تھرڈ۔

جولائی ۱۹۸۰ء میں ہمارے پاس بچوں کی تعداد آئی تھی۔ پہلی میں چونتیس مسلم تھے، دوسری میں انیس، تیسری میں پندرہ چوتھی میں نو اور پانچویں میں آٹھ یعنی کل پچاسی۔ مگر سالانہ امتحان ۱۹۸۱ء تک بتدریج ہر کلاس میں اکیس، نو، دس ۱۰، چھ اور نو مسلم بچے رہ گئے۔ یعنی کل پچپن۔ گویا تیس مسلم بچے بیچ میں پڑھائی چھوڑ گئے۔

تین ہزار مسلمانوں کے قریب ڈیڑھ ہزار بچے پندرہ سال سے کم عمر کے ہوں گے جن میں سے قریب چھ سو بچے چار سے گیارہ سال تک کی عمر کے ہوں گے۔ ان میں سے صرف پچاسی اسکول میں داخل ہوئے تھے اور صرف پچپن سالانہ

امتحان تک رہے۔ یعنی اس گاؤں کے دس فیصد مسلم بچے کبھی پرائمری تعلیم تک نہیں حاصل کرتے۔ آگے کی تعلیم کا کیا سوال ہے۔

پورے اسکول میں صرف ایک مسلم لڑکی تھی۔ یعنی مسلم لڑکیوں کی تعلیم تو اور بھی بُری طرح نظرانداز ہو رہی ہے جب کہ اسلام لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو بالکل ایک برابر اہمیت دیتا ہے یعنی

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ

علم حاصل کرنا فرض ہے ہر ایک مسلم مرد اور ہر ایک مسلم عورت پر۔

کناوہ میں برسہا برس تک دینی مدرسے کو امداد دی گئی۔ مگر اس مدرسے میں بچے تیسری جماعت تک بھی نہ پہنچے تھے۔ جب معائنہ ہوا بیشتر بچے غائب ملے۔ خود اس مدرسے کے منیجر جناب ابوالحاص خاں شیروانی صاحب نے مجھ کو لکھا: "یہاں کے ہمراں و صدر سب کے سب پٹھان اور متمول ہیں مگر مدرسے سے کچھ دلچسپی نہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ مولوی صاحب بالکل ناقابل ہیں۔ میری موجودگی میں آپ کے آرگنائزر صاحب نے جانچ کی۔ بچوں کو الف ب تک بھی نہیں آتی تھی۔ انھوں نے کچھ کہا تو مولوی صاحب اُن سے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ مولوی صاحب کے حافظ ہونے کا یہ عالم ہے کہ تراویح میں قرآن سُنانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی اور حافظ نماز میں شریک ہو۔ کہہ دیا کہ اگر دوسرا حافظ موجود ہوا تو میں قرآن نہیں سُناؤں گا۔"

دوسری طرف مولوی صاحب نے مدرسہ کی بدحالی کی وجہ یہ بتائی۔ کہ بچوں کو اس لئے کچھ نہیں آتا کہ پٹھانوں کے بچے ہیں۔ کچھ دن مدرسے آ کر گھر بیٹھ رہتے ہیں۔ اور فقیر اور لوہار اپنے بچوں کو مدرسے میں اس لئے نہیں بھیجتے کہ ان کو شکایت ہے کہ پٹھان اُن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اس لئے مدرسہ میں تعلیم نہیں ہو پاتی۔

ہم نے بارہا کوشش کی کہ حالات بہتر ہوں۔ بارہا سمجھایا کہ مدرسہ میں تعلیم ٹھیک سے ہونی چاہئے۔ مگر جب معائنہ ہوا حالات چوپٹ نظر آئے۔ جس مدرسے میں پڑھائی ہی نہ ہو رہی ہو اُس مدرسے کو امداد کب تک دی جاسکتی ہے؟ پھر بھی ہم نے مدرسے کے منیجر صاحب کو خط لکھا مگر انھوں نے جب اس کا بھی جواب نہ دیا تو مجبوراً امداد بند کرنی پڑی۔

اب سُنا ہے کہ کناوہ کے پٹھان ناراض ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم دینی تعلیم کو دُنیاوی تعلیم سے افضل و مقدم سمجھتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ بچوں کو ضلع بورڈ کے اسکول میں ہندی، حساب، جغرافیہ پڑھوائیے اور اپنے دینی مدرسے میں ان کو کلام پاک اور دینیات پڑھوائیے۔

اگر ہم یہ دیکھیں گے کہ ضلع بورڈ کے پرائمری اسکول میں مسلم بچوں کی تعداد قابل لحاظ ہے اور یہ بچے وہاں تمام مضامین اچھی طرح پڑھ رہے ہیں، ان کی تعلیم خاطر خواہ ہو رہی ہے تو ہم دینی مدرسے کی امداد بھی بحال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کناوہ کے بیشتر بھائیوں نے طے ہی کر لیا ہے کہ بچوں کی تعلیم کا گلا گھونٹ کر ہی دم لیں گے تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے؟ جتنے بچے پڑھ رہے ہیں ہم ابھی سے ہونہار بچوں کو انعامات دینے کی کوشش کریں گے۔ اور کیا کریں؟ کوئی صاحب بتائیں۔

اللہ نے کناوہ کے مسلم بچوں کو جتنی ذہانت دی ہے ان بچوں کے باپ اتنے ہی بضد ہیں کہ بچوں کی ذہانت کا کوئی صحیح استعمال نہ ہونے دیں گے۔ بچوں کو پڑھنے ہی نہ دیں گے۔ ضلع بورڈ کے اسکول میں جا کر خان صاحبان کے بچوں کی توہین جو ہو جائے گی۔ اس لئے نہایت ذہین اور ہونہار مسلم بچے گلیوں میں انٹے کھیلتے پھرتے ہیں۔

کناوہ ضلع ایٹہ کا ایک گاؤں ہے۔ (حسنِ اتفاق سے میری ننہال بھی ہے) یہاں قریب پچیس فیصد مسلم آبادی ہے۔ ضلع بورڈ کا پرائمری اسکول ہے جس کے ہیڈ ماسٹر افسر علی صاحب ہیں۔

اس سال کے سالانہ امتحانوں کے رزلٹ آئے۔ پہلی کلاس میں چالیس غیر مسلم بچے شریک اور صرف ایک عدد مسلم بچہ اسرار احمد خاں شریک اور وہی فرسٹ آگیا۔ رام نریش سکنڈ اور کرشن کانت تھرڈ۔

دوسری کلاس میں تینتالیس غیر مسلم بچے اور صرف پانچ مسلم بچے شریک۔ فرسٹ اقبال احمد خاں، سکنڈ اونکار سنگھ اور تھرڈ مول چند۔ پانچ مسلم بچوں میں سے ایک کلاس میں فرسٹ اور باقی چار پاس ہو گئے۔

تیسری کلاس میں ستائیس غیر مسلم بچے شریک اور ایک مسلم بچہ شریک (جو فیل ہو گیا) فرسٹ لٹوری، سکنڈ بنر ندر سنگھ اور تھرڈ ہرکشن چند۔

چوتھی کلاس میں پندرہ غیر مسلم اور تین مسلم بچے شریک۔ فرسٹ جے پال سنگھ، سکنڈ وجاہت اللہ خاں اور تھرڈ گربند سنگھ۔ تین مسلم بچوں میں سے ایک نے سکنڈ پوزیشن لی باقی دو بھی پاس ہو گئے۔

پانچویں کلاس میں بائیس غیر مسلم بچے شریک اور تین مسلم بچے شریک۔ فرسٹ رام جیت، سکنڈ مُمتا خاں اور تھرڈ وصیف الاسلام تینوں مسلم بچوں میں سے دو نے پوزیشن لی اور تیسرا بھی پاس۔

یعنی کُل تیرہ مسلم بچے پانچ کلاسوں کے امتحان میں بیٹھے۔ صرف ایک فیل ہوا۔ باقی بارہ پاس اور ان میں سے پانچ نے اپنی کلاس میں پوزیشن حاصل کی۔ جب کہ ایک سو سینتالیس غیر مسلم بچوں میں سے تیئیس فیل ہوئے اور جو ایک سو چوبیس پاس ہوئے ان میں سے صرف دس نے پوزیشن حاصل کی۔

صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کناوے کے مسلم بچوں کو بہت ذہانت دی ہے۔ جو مسلم بچے پڑھ رہے ہیں وہ اپنی کلاس میں ممتاز رہ رہے ہیں۔ یہ اُس غفورالرحیم کی کتنی